پروفیسر خالد شبیر احمد قسط:۳۶

ورق ورق زندگی

صحرائی صاحب سے ملاقاتیں:

پروفیسر فروغ جلیل اپنے کمرے میں بیٹھتے تھے کبھی کبھی اُن کے ساتھ بھی ملاقات ہوتی تھی، اُن کا تعلق ایک دینی گھرانے کے ساتھ تھا۔ اُن کے بڑے بھائی جن کا نام اب میرے ذہن سے اتر چکا ہے، صحافی تھے۔ اپنے نام کے ساتھ قریشی کا اضافہ بھی کرتے تھے۔

فروغ جلیل صاحب بھی طیب قریشی کے قریبی دوستوں میں تھے اور کبھی کبھی طیب صاحب کے کمرے میں ہمارے درمیان بھی آ بیٹھتے۔ انتہائی ملنسار اور دھیمے مزاج کے تھے جب بات کرتے تو جی چاہتا کہ اُنھیں توجہ سے بس سنا جائے۔ اُن کی رہائش بھی شہر کی سب سے بڑی مسجد صادق کے ساتھ تھی۔ میں کبھی کبھی فروغ صاحب کے گھر بھی چلا جاتا تھا۔ اُن کے والد صاحب جن کو صحرائی صاحب کے نام سے ہی پکارا جاتا تھا، وہ بھی ہمارے درمیان آ بیٹھتے، اور بات چیت میں شریک ہوجاتے۔ جب بھی میں اُن کے گھر جاتا وہ مجھے دیکھتے تو کہتے ''وہ احراری پروفیسر آ گیا''، لیکن انتہائی شفقت کے ساتھ پیش آتے۔ اکثر اُن سے تحریک پاکستان میں مجلس احرار اسلام کے نظریہ و کردار پر گفتگو ہوتی۔ اُن کا تعلق مسلم لیگ کے ساتھ رہا تھا۔ اس لیے اُن سے خوب گرما گرم بحث ہوتی تھی لیکن انتہائی اچھے انداز میں۔ میں اپنے بزرگوں کی طرح اُن کی عزت کرتا اور وہ اپنے بچوں کی طرح مجھ سے پیار کرتے۔ وہ مجھے اب بھی یاد آتے ہیں تو اُن کی شفقت اور محبت کے بہت سے گہرے تأثرات میرے حافظے کو گھیر لیتے ہیں۔ ایک دن وہ مجھے کہنے لگے کہ:

''بیٹے! میں تمھارے ساتھ دل لگی کے طور پر بحث کرتا ہوں، جو کچھ اکابر احرار قیام پاکستان سے پہلے پاکستان کے بارے میں کہتے تھے وہ سچ تھا۔ ہم ہی اسلام کے نام پر ان مسلم لیگ والوں سے دھوکا کھا گئے۔ اس کے بعد انہوں نے ایک واقعہ سنایا کہ مولانا شبیر احمد عثمانی آخری بار یہاں بہاول پور میں آئے تو شدید نوعیت کے بخار میں مبتلا ہو گئے تھے۔ ایک دن ہم سب عقیدت منداُن کی چارپائی کے اردگرد بیٹھے تھے، (میں بھی اُن کی وجہ سے ہی مسلم لیگ میں شامل ہوا تھا اور اُن کے عقیدت مندوں میں ہی شمار ہوتا تھا) تو اپنے عقیدت مندوں کو مخاطب کر کے کہنے لگے کہ اگر میں یہیں بہاول پور میں فوت ہو جاؤں تو مجھے یہیں پر دفن کر دینا۔ اس پر ہم نے جواباً کہا کہ حضرت آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں اللہ تعالیٰ آپ کو شفا عطا کرے اور آپ کی زندگی دراز ہو، آپ کا سایہ ہمارے سروں پر قائم رہے۔ کہنے لگے کیا شفا اور کیا زندگی؟ میں تو اس دن ہی مر گیا تھا جب مجھے لیاقت علی خان نے یہ کہا کہ مولانا اب آپ ہمیں مشورے نہ دیا کریں، اپنے گھر آرام کریں اور ہمیں جب آپ کے مشوروں کی ضرورت ہوگی آپ کے ہاں آ کر آپ سے مشورہ لے لیا کریں گے''۔

یہ کہتے ہوئے صحرائی صاحب کی آنکھ سے آنسو ٹپک پڑے اور میں بھی حیران ہو گیا کہ ایسا بھی ہوا

ہم فریب آرزو میں آ گئے
دیدہ و دانستہ دھوکا کھا گئے

طیب قریشی صاحب بڑے وضع دار شخصیت کے مالک ہیں۔ اپنے مضمون کے علاوہ اُن کا اردو ادب کے ساتھ بھی اچھا اور خوب تعلق رہا اور اب بھی ہے۔ وہ میرِ محفل تھے، انتہائی مخلص اور ملنسار، کالج کے اندر بھی اُن کا خاص مقام و مرتبہ تھا۔ جتنے بھی پروفیسر حضرات میری موجوگی میں کالج آئے سبھی اُن کا احترام کرتے تھے۔ پھر شہر کے اچھے لوگوں کے ساتھ اُن کے بہترین تعلقات اور لوگ اُن کے نام سے آشنا تھے۔ جدھر جاتے لوگ اُن کے احترام میں سر جھکا دیتے۔ عموماً یہ دیکھا گیا کہ پروفیسروں کا زیادہ تعلق کالج کے دوسرے پروفیسروں تک ہی محدود رہتا ہے لیکن طیب قریشی جتنے کالج کے اندر مقبول تھے اُس سے کہیں زیادہ شہر کے لوگوں کے دلوں میں اُن کا احترام تھا۔ ٹیبل ٹاک میں بھی اُن کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اُن سے تعلق بڑھتا گیا اور اب بھی ہے۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ میں جہاں بھی رہا اللہ تعالیٰ نے بہت ہی افاضل اور اخیار کی رفاقت نصیب فرمائی۔

پروفیسر عطاء اللہ اعوان اور میرے درمیان قدر مشترک امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ سے عقیدت و محبت تھی۔ ہم دونوں جب اکیلے ہوتے تو ایک دوسرے کو امیر شریعت کے ہی واقعات سناتے رہتے اور اس طرح کبھی کبھی ہم دونوں کی آنکھوں سے اُن کی غیر معمولی محبت اور شفقت جو انھوں نے ہمارے ساتھ روا رکھی آنسو بن کر ہمارے دل و دماغ کو ہی نہیں بلکہ ہماری روح تک کو دھو کر معطر کر دیتی۔ حضرت امیر شریعت کے کچھ واقعات میں نے ان سے سنے اور کچھ باتیں مرشدی امیرِ شریعت کی اُنھوں نے مجھ سے سُنیں۔ مزاج کے اعتبار سے بھی انتہائی مخلص اور طرح دار ہیں یعنی اُن کی شخصیت میں انفرادیت ہے۔ فقر پر ناز، دین سے لگاؤ اور عزم میں پختگی۔ ایک دفعہ جو راہ راست پر آئے تو پھر پاؤں نہیں ڈگمگائے، سارا خاندان قادیانی، یہ ایک مسلمان۔ کہتے تھے کہ

''مجھے اپنے خاندان والوں سے دھمکیاں بھی ملیں اور لالچ بھی دیا گیا۔ لیکن میں نے نہ دھمکیوں کی پرواہ کی اور نہ ہی اُن کے لالچ میں آیا اور یہ سب اللہ کا کرم تھا اور ہے۔ ایک دن میں نے اُن سے پوچھا کہ کیا عمر کے اُس حصہ میں آپ نے جو فیصلہ کیا تھا اس کا محرک صرف امیر شریعت کی تقریر ہی تھی یا اس کے علاوہ کچھ اور بھی تھا؟ کہنے لگے کہ صرف امیرِ شریعت کی تقریر ہی تھی یا شاید یہ بات بھی ہو کہ سکول میں میرے ہم مکتب میرے بارے میں دوسرے طالب علموں سے یہ کہتے کہ یہ عطاء اللہ اعوان مرزائی ہے۔ جب میں سنتا تو مجھے محسوس ہوتا کہ مرزائی ہونا کوئی بری بات ہے کہ مجھے مرزائی کہتے ہیں۔ یہ ایک بات اس تقریر کے علاوہ ہے۔ لیکن وہ تقریر تو میرا کام کر گئی۔ مجھے اس تقریر کے دوران یوں محسوس ہوتا تھا کہ میں جہنم میں ہوں اور وہ سامنے مجھے جنت بلا رہی ہے''۔

اور پھر میں نے دیکھا کہ ماشاء اللہ اُن کی اولاد سعادت مند اور لائق ہوئی، بچیاں ڈاکٹر، داماد صالح اور شریف، عمدہ فراخ رہائش گاہ، ذاتی سواری، غرض اللہ نے خوب نوازا۔ اس تحریر سے دو دن پہلے میری اُن سے فون پر بات ہوئی تو

کہنے لگے کل عمرے پر جا رہا ہوں تمھارے لیے دعا کروں گا۔ میں نے کہا کہ اب بس کر دو، کہنے لگے بس کیوں کروں وہ بلاتے ہیں میں کیوں نہ جاؤں۔ میں نے پوچھا کتنی بار جا چکے ہو؟ گن کر بتایا تیرھواں عمرہ ہے اور پانچ حج کیے ہیں، اللہ قبول کرے۔ میں نے جواب میں کہا کہ اللہ نے ایمان پر ثبات کے ساتھ جمے رہنے کا بدل تو تمھیں دنیا میں ہی دے دیا ہے۔ دُعا ہے کہ آئندہ جہان میں بھی اللہ پاک اُنھیں اور مجھے ہمارے مشترک محبوب حضرت شاہ جی کی رفاقت میں جنت الفردوس سے نوازیں اور حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت نصیب کرے۔ (آمین)

اشتراکی دوستوں سے بحث ومباحثہ:

عابد صدیق جب رحیم یار خان سے تبدیل ہو کر آئے تو اچھے خاصے خود بھی تبدیل ہو چکے تھے۔ لباس میں تو تبدیلی آئی تھی۔ اندازِ فکر بھی تبدیل ہو چکا تھا۔ سر پر موٹے کپڑے کی دستار، پینٹ کوٹ چھوڑ چھاڑ کے شلوار قمیص لباس تھا۔ موسیقی کو بھی انھوں نے آہستہ آہستہ چھوڑ دیا تھا۔ چہرے پر داڑھی کا اضافہ ہو چکا تھا۔ بعض اوقات لکڑی کی کھڑاویں ڈالے بھی کالج میں آ جاتے تھے۔ جن کے من میں سب کچھ ہوتا ہے وہ اپنے تن کی زینت پر کوئی توجہ نہیں دیتے۔ بہرحال اس تبدیلی کے باوجود شعر وسخن کے ساتھ وہی تعلق رہا۔ جو ہم سب کے لیے بڑی خوشی کی بات تھی۔

عابد صدیق، اسلم انصاری، اسدا ریب، سہیل اختر ہمارے کالج کے شاعر تھے۔ جن سے اکثر کلام سن کر ہم لطف اندوز ہوتے۔ بہاول پور شہر میں بھی مشاعروں کا اہتمام ہوتا تھا۔ یہ مشاعرے تابش الوری کے مکان پر ہوتے۔ ظہور نظر ملک کے مشہور شاعر تھے اُن سے بھی ملاقاتیں رہیں۔ لیکن یہ ملاقاتیں شہر کے کسی ہوٹل میں ہی ہوتی تھیں۔ سوشلسٹ ذہن کے تھے، ان کے ساتھ خوب بحث ہوتی۔ عقل اور عشق کی اس بحث میں عموماً عشق کے سامنے عقل اپنا سر جھکا ہی لیتی تھی۔ بہاول پور میں میرا واسطہ اشتراکی دوستوں سے اکثر پڑتا رہتا تھا۔ کالج میں نواز قاسمی اور بعد میں آنے والے اشتراکی رشید الزماں سے بھی مباحثے ہوتے۔ یہ دونوں حضرات مجھے یہ طعنہ دیتے کہ تم لوگ یعنی دین والے اندھے عقیدوں کے تحت زندگی بسر کرتے ہو زندگی کے بارے میں آپ لوگوں کی ''اپروچ'' ریشنل نہیں ہے۔ عقل سے کام نہیں لیتے اور عقیدے کے پیچھے بھاگتے رہتے ہو۔ ایک دن طیب قریشی کے کمرے میں اس پر خوب بحث ہوئی۔ میں نے جواب میں کہا تمھارا یہ موقف بھی تمھاری غلط فہمی ہے۔ ہماری اپروچ ہی ریشنل ہے۔ ہم ایک ایسی شخصیت کی ہر بات کو دل ودماغ کی گہرائیوں سے تسلیم کرتے ہیں کہ جس کے بارے میں اس شخصیت کی شدید مخالفت کرنے والوں نے بھی کبھی یہ نہیں کہا کہ یہ جھوٹ بولتا ہے، اُنھیں جادوگر کہا گیا، ان کے راستے میں کانٹے بچھائے گئے، طائف کی گلیوں میں اُن پر پتھروں کی بارش کی گئی، گزرتے ہوئے ان پر گندگی پھینکی گئی، شعبِ ابی طالب میں خاندان سمیت اُنھیں قید کیا گیا، حرم کعبہ میں سجدے کی حالت میں اُن پر اُونٹ کی اوجھڑی ڈال دی گئی۔ لیکن اس کے باوجود اُنہیں صادق بھی کہا گیا اور امین بھی، اب آپ لوگ بتائیں کہ ایسے شخص کی ہر بات کو تسلیم کرنا اور اس کی ہر بات کو عقیدے کا جز بنا لینا کیا عقل کی بات نہیں ہے؟ پھر بقول آپ کے اس زندگی جو موت پر ختم ہو جاتی ہے کے بعد اگر آخرت کی زندگی بقول آپ کے نہیں ہے، نہ دوزخ نہ جنت، نہ حساب

نہ کتاب، نہ محشر نہ کوئی اور شے، تو ہم جن کا ان سب باتوں پر یقین ہے اور یہ سب کچھ ہمارے ایمان اور عقیدے کا حصہ ہے تو ہمیں کیا فرق پڑے گا۔ جہاں آپ مٹی کے ذروں میں تبدیل ہو کر پڑے ہوں گے یہیں ہم بھی ہوں گے اور اگر اس کے برعکس وہ سب کچھ جو ہم اپنے عقیدے کی بنیاد پر یقین رکھتے ہیں مرنے کے بعد ہوا تو پھر آپ وہاں پر کیا جواب دیں گے؟ اب ان دونوں علیحدہ علیحدہ مؤقف کے ساتھ زندگی بسر کرنے والوں میں سے کون سی زندگی عقل کے مطابق ہے اور کون سی زندگی عقل کے خلاف ہے۔ اس کا فیصلہ یہاں بیٹھے ہوئے احباب کرلیں کیونکہ آپ لوگوں کو تو اس خدا نے اس بات کی توفیق ہی نہیں دے رکھی کہ عقل کی کوئی بات تسلیم کرلو۔ وہاں پر سب پروفیسر میری اس بات کی حمایت میں تھے اور ان دونوں حضرات سے اس بات کا تقاضا کر رہے تھے کہ اب بتاؤ تمھاری زندگی ریشنل ہے یا پھر وہ زندگی جو کسی عقیدے اور کسی پر ایمان لانے والوں کی زندگی ہے وہ ریشنل ہے، تو ان دونوں کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس کے بعد یہ بحث ختم ہو گئی کہ ہم مسلمانوں کی زندگی ریشنل ہے۔ عقل کے مطابق ہے یا پھر نظریہ اشتراکیت اور دہریت پر یقین رکھنے والوں کی زندگی عقل کے مطابق ہے۔ ایسی کئی بحثیں وہاں پر ہوتی تھیں۔ جس کے لیے میں ان اشتراکی دوستوں کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے میری دینی غیرت وحمیت کو برقرار رکھنے میں میرے ساتھ تعاون کیا۔

عابد صدیق کی تبدیلی کی وجہ:

بات عابد صدیق کی ہو رہی تھی کہ اُن کی زندگی ملتان میں بسر ہونے والی زندگی کے بالکل برعکس تھی۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے بچوں کی پیدائش کے بعد اُن اہلیہ اکثر بیمار رہنے لگ گئی تھیں۔ چار پائی سے اٹھنے کے قابل نہ رہیں تو گھر کا سارا کام عابد کو کرنا پڑتا تھا۔ بچوں کی دیکھ بھال، پرورش، بچوں کا کھانا وغیرہ وہ خود ہی پکاتے تھے۔ کپڑے اور برتن بھی خود دھونا اور گھر کی صفائی کرنا اُن کے فرائض میں شامل تھا۔ لیکن کمال یہ ہے کہ ان گھریلو ذمہ داریوں کے باوجود کالج میں بھی وہ اپنے فرائض سے غافل نہ رہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ انھوں نے اپنے بچوں کی پرورش خود کی اور وہ تمام ذمہ داریاں جو بچوں کی طرف سے ان کی والدہ پر عائد ہوتی تھیں وہ عابد صدیق نے سرانجام دیں تو یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا اور یہی وہ ریاضت تھی جس نے اُن کا رخ معرفت اور تصوف کی طرف موڑ دیا اور انھوں نے اپنی پہلی زندگی کو خیر باد کہہ کر ایک نئی زندگی اختیار کرلی تھی۔ اسی دوران اُن کا تبلیغی جماعت سے بھی تعلق قائم ہو گیا۔ وہ بڑے ذوق وشوق کے ساتھ ان کے اجتماعات میں شرکت کرتے اور کبھی کبھی وقت نکال کر اُن کے ساتھ تبلیغ کے لیے بھی نکلتے تھے۔

رائے ونڈ حاضری:

میری فیصل آباد تبدیلی کے بعد وہ بہاول پور سے طیب قریشی اور پروفیسر عطاء اللہ اعوان کے ساتھ میرے پاس فیصل آباد آئے اور مجھے ''گرفتار'' کر کے رائے ونڈ کے سالانہ اجتماع میں لے گئے۔ ایک رات وہاں پر قیام اور پھر دعا میں شرکت میری زندگی میں انھی کی وجہ سے ممکن ہوئی۔ واپسی پر جب ہم کوٹ عبدالمالک پہنچے عشاء کی نماز کا وقت تھا تو ایک گرانڈیل کتے سے ہماری کار کی ٹکر ہوگئی جس سے ہماری کار کا جو پروفیسر طیب قریشی کی ملکیت تھی ''ریڈی ایٹر'' تباہ ہو گیا اور

کار سفر کے قابل نہ رہی۔ مجبوراً ہمیں سڑک کے کنارے ہی رات بسر کرنا پڑی اور دوسرے روز ہم کار کی مرمت کرا کر سفر کے لیے روانہ ہوئے۔ میرے لیے یہ ایک تاریخی سفر تھا جس میں مجھ جیسے گنہگار کو بھی عابد صدیق، طیب قریشی اور عطاء اللہ اعوان کی وجہ سے ایسے روحانی اجتماع میں شرکت کا موقع ملا۔ حالانکہ میں طبعاً دین اسلام کی قوت، شوکت اور سطوت کے حوالے سے اسلام کی تبلیغ کی بجائے اسلامی انقلاب کو موجودہ دور اور وقت کے تقاضے کے عین مطابق سمجھتا ہوں اور دینِ اسلام کی تبلیغ کے لیے تبلیغی جماعت کے اس مخصوص طریقۂ تبلیغ کے لیے جو حکمت اور دانائی ضروری ہے اس سے اپنے آپ کو عاری سمجھتا ہوں۔ اس لیے اسے سراہنے کے باوجود اپنے آپ کو اس کا اہل نہیں سمجھتا۔

کچھ عابد صدیق کی شاعری کے بارے میں:

شاعری عابد صدیق کے رگ و ریشے میں خون کی طرح گردش کرتی تھی۔ وہ فطری شاعر تھے۔ ہماری طرح کے شاعر نہیں تھے۔ اُن کے خیالات کا کینوس وسیع اور پروازِ تخیل بلند تھا۔ خوبصورت اور دلکش تراکیب سے وہ اشعار میں جاذبیت اور دلکشی پیدا کرنے میں خاص مہارت رکھتے تھے۔ الفاظ کا چناؤ اور غزل کا اسلوب منفرد تھا۔ شاعری اگر حسن اظہار کا نام ہے تو ان کی شاعری میں یہ حسن اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ چمکتا دمکتا نظر آتا ہے۔ پھر شاعری کو چار چاند لگانے کے لیے فنِ شاعری سے آشنائی اور مطالعے کی وسعت بھی انتہائی اہم کردار ادا کرتی ہے اور عابد صدیق ان دونوں خوبیوں میں اپنی مثال آپ تھے۔ وہ فن شاعری پر مکمل دسترس رکھتے تھے اور ادب کی جملہ صفات اور اس کی وسعتوں پر ان کی گہری نظر تھی۔ اُنھیں اگر اسلم انصاری کی طرح پڑھے لکھے لوگوں کا شاعر کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اُن کی شاعری میں سوز گداز بھی ہے اور نکھار و پیار بھی ہے۔ جس کے ساتھ ساتھ معاشرے کا کرب اور اضطراب اُن کی شاعری میں نظر سے دل و دماغ کی گہرائیوں میں اترتا محسوس ہوتا ہے۔ جو جدید شاعری کا جز اوّل اور طرۂ امتیاز ہے۔ خیالات کا انوکھا پن اُن کی شاعری کا خاص وصف ہے۔ ان کی شاعری کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات کہی جاسکتی ہے:

تو نے عطا کر دی نئی سمت سخن کو
تجھ جیسا کہاں تھا سخن آباد نے دیکھا

وہ شعروں میں اپنی بات کہتے اور انھیں اس بات کی کوئی پروا نہیں تھی کہ اُن کے بارے میں لوگ کیا کہتے ہیں اور کیا سوچتے ہیں۔ اُن کی غزل کے اس شعر سے اسی بات کی ترجمانی ہوتی ہے:

عابدؔ نہ راستی کی روش ہم سے چھوٹ سکی
مانا جبینِ دہر پہ لاکھوں شکن پڑے

اسی غزل کے ایک دوسرے شعر میں کیسی خوبصورت بات کو کیسے انوکھے انداز میں بیان کرتے ہیں۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ شاعری میں انداز بیان وہ بنیادی وصف ہے جو ایک شاعر کو مرنے کے بعد بھی زندہ رکھتا ہے ورنہ تو ہر شاعر اپنے انداز میں کچھ نہ کچھ بیان کرتا ہی رہتا ہے۔ بات کیا ہے؟ یہ اتنا اہم نہیں ہے جتنا کہ کیسے بیان کی گئی ہے۔ اس پر ہی کامیاب شاعری کا

دارومدار ہے۔ اُن کا یہ شعر اوپر بیان کیے گئے معیار کتنا پورا اترتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

یادوں کے سلسلے میں تیرے لطف کا خیال
سورج کی آبشار میں جیسے کرن پڑے

یادوں کے لطف کو سورج اور کرن کے حوالے سے کتنا خوبصورت بنا دیا ہے، اس خیال کو نہ جانے کتنے شعرا نظم کر چکے ہیں لیکن یہ بات اس انداز میں میری نظر سے نہیں گزری۔ ایک اور غزل میں ایک قومی المیہ جو ہماری تاریخ کا ایک ایسا المیہ ہے جس پر جتنے بھی آنسو گرائے جائیں کم ہیں۔ اسے آپ نے شعر میں یوں بیان کیا ہے:

رنج گھر چھوڑنے کا رستوں میں
منزلوں پر نہیں پذیرائی!

اوران کے اپنے خیال میں اُن کی شاعری کیا ہے۔ اسی غزل کے دوسرے شعر میں موجود ہے:

شاعری ایک حسرتِ اظہار
ان کہی مدعائے گویائی

ان کا ایک خوبصورت شعر میرے کانوں میں رس گھولتا رہتا ہے:

ہم کو جنوں نہ ہو مگر اتنا تو ہو کہ ہم
جس گھر میں چاندنی ہو اسے تیرا گھر کہیں

ایک اور غزل کے بھی چند اشعار دیکھئے:

صحرا میں اک عجب سی آسودگی ملی
بے وجہ تو نہ شہر میں دل بے قرار تھا
نادم ہو کے چھوڑ گئے چارہ ساز بھی
آسودگی میں اپنی کچھ ایسا وقار تھا
عابدؔ سے کل ملے تو طبیعت لگی رہی
درویش آدمی تھا بڑا وضعدار تھا

کتنا عرصہ پہلے کہی ہوئی یہ غزل حالاتِ حاضرہ کی کیسی خوبصورت عکاسی کرتی ہے۔

تانبا زمین تھی، آگ فلک، ایک قہر تھا
درویش آدمی کو قیامت کا پہر تھا
ملبوس خوف و جوع میں لپٹی ہیں بستیاں
اب دشتِ بے اماں ہے جو خوابوں کا شہر تھا

اور یہ شعر کتنا خوبصورت ہے:

ہم تشنگی سے زیر ہیں، ہر چند علم ہے
جس نے پیا، اُسی کے پیالے میں زہر تھا

اس پر مجھے اپنا ایک شعر یاد آیا۔ عابد صدیقؒ کے اس شعر سے قدرے مختلف ہے تاہم کچھ مماثلت ضرور ہے:

ہر چند جامِ زیست میں زہرابِ مرگ تھا
میں تشنگی سے چُور تھا پینا پڑا مجھے

عابد صدیق کو ہندی کو اردو کے ساتھ ملا کر شعر کہنے میں جو کمال حاصل تھا۔ اس کے ہم سب معترف ہیں۔ ان کی وہ غزلیں جو اس رنگ میں ڈھلی ہیں انوکھی اور اچھوتی حیثیت میں نہ صرف دماغ بلکہ دل پر بھی اپنا نقش چھوڑ جاتی ہیں۔ اگر شاعری ادب لطیف ہے تو ایسا لطف آپ کو ان کی غزلوں میں وافر ملے گا۔ جن میں ہندی کی آمیزش بڑی خوبصورتی اور مہارت کے ساتھ کی گئی ہے۔ ساتھ ہی یہ احساس بھی بڑی شدت کے ساتھ ابھرتا ہے کہ ہندی زبان سے اُن کا اچھا خاصا لگاؤ تھا۔ انھوں نے اس لگاؤ سے اپنی شاعری میں ایسی رعنائی اور دلکشی پیدا کی ہے جس کی وجہ سے وہ شعرا کی صف میں ممتاز و منفرد حیثیت اختیار کر گئے ہیں چند ایسے اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

پہرے چوکی سے کب چھوٹی جنم جنم کی پریت — ہم سے ملنا چاہو تو ملنے کے سو ڈھنگ
پائل کی جھنکار سنی تو مُرلی کے سر ہوئے — جوگی جی کے کام نہ آئی اُن کی رام ترنگ
عابد جی تم ایک بھلے ہو، سوچ کے پینگ بڑھاؤ — پیچ پڑے پر ٹھہر سکے گی کتنی دیر پتنگ

☆☆☆

لہر اُٹھی ہر انگ میں آئی ساون رت متوالی — من میں پریت کا اکھوا پھوٹا، لچکی من کی ڈالی
بھولپنے میں نام لیے جائیں جوگی کا سکھیاں — بس پھر میں انجان بنوں، پر مارے لاج کی لالی
جوگی بَن بسرام کرے اور مایہ جال بچھائے — ہم تو جانیں زبل تھا جو بھاگا چھوڑ کے پالی
اکھیاں رونا سیکھ گئیں تو چھوٹا پنگھٹ پھیرا — دکھ کی من میں جوت جگی تو بھول گئی دیوالی

میرے جیسے کم علم کو کیا پتہ کہ عابد صدیق کی جملہ صلاحیتوں کو کیسے خراجِ تحسین پیش کیا جا سکتا ہے۔ بس اپنے ہی اس شعر پر یہ کہانی ختم کرتا ہوں۔

ہو گا احاطہ مجھ سے کہاں اُس کے علم کا
وہ ما ورائے نرغۂ الفاظ شخص تھا